Advertisement at Urdu Palace

Are you looking for an affordable website to advertise your business?
Urdu Palace offers lowest rates for all advertisers.
For Advertisement of your brand or business on our website call us or contact through

Whatsapp on following numbers:+92-348-8709449,+92-303-5110135

آدابِ جاں سوزی

تسنیم منیر علوی

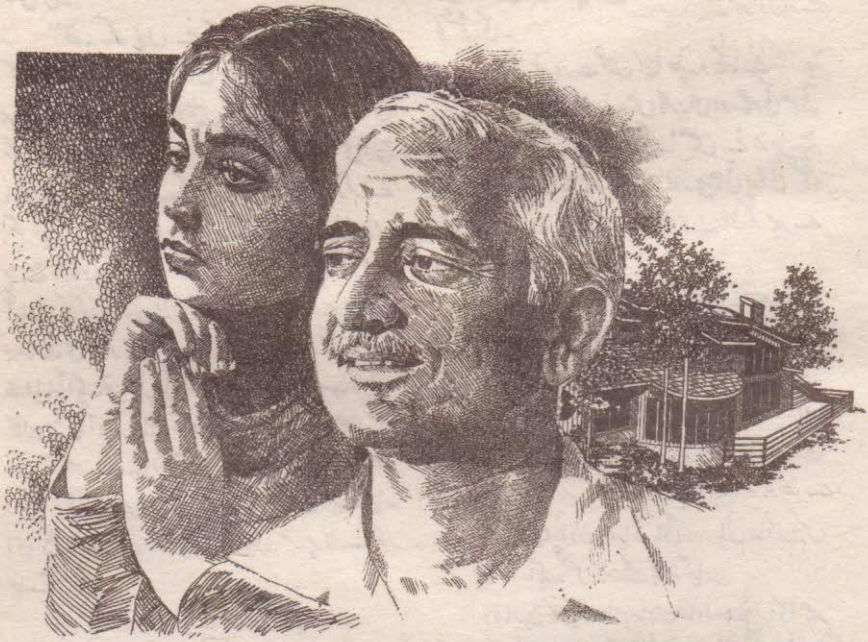

''بابا جلدی اندر آئیں بارش ہونے والی ہے، گھٹائیں گھر گھر کر آچکی ہیں۔'' ٹپ، ٹپ بوندوں کا جلترنگ شروع ہوا۔ فضا میں سوندھی مٹی کی خوشبو اڑی۔ میری آواز پر بابا نے تیزی سے اپنی کرسی اور کتاب لے کر اندر کی طرف دوڑ لگائی، میں بھی مدد کے لیے ساتھ ہی لپکی..... اور اب بادل ٹوٹ کے برس پڑے۔ بابا نے ٹیرس کے شیڈ میں آکر ایک بلند و بانگ نعرہ لگایا۔

''ارے شبانہ کہاں ہو، آج تو تمہاری بیٹی نے موسمیات کو شکست سے دوچار کر دیا۔'' میں نے بابا کو اندر لاؤنج میں لا کر سہارے سے بٹھایا۔ کپڑوں پر پڑی بوندوں کو جھاڑا۔

''بابا آپ اس بات پر حیران نہ ہوں۔'' اب میں قالین پر آلتی پالتی مار کر اُن کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی تھی۔

''قصہ کچھ یوں ہے کہ جب ہم چھوٹے ہوا کرتے تھے تو ہماری نانی امی جب کبھی نیلے آسمان پر بہت دور، دور اونچائی پر چیلیں اُڑتے دیکھتیں اور حبس بھی بہت ہوتا تو ہاتھ سے اشارہ کرتیں۔ دیکھو مشی آج بارش ہوگی تو ہم بھی آپ کی طرح حیرت کا اظہار کرتے مگر ایک گھنٹے کے اندر اندھیرا چھا جاتا، بادل برس پڑتے اور وہ جھل تھل مچتی اور سارے بچے نظیر اکبر آبادی کی کورس میں پڑھی نظم ''کیا کیا مچی ہے یاروں برسات کی بہاریں'' لہک، لہک کر گانے لگتے۔ اُف خدایا بابا! ایک تو بارش کی گرج چمک پھر ہم سب کا شور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ چھپا چھپ چھلانگیں مارتے چھوٹے بچے، کاغذ کی ناؤ بنا بنا کر پانی میں چھوڑ دیتے کوئی کہتا میری کشتی پہلے پار کر گئی میں جیت گیا۔ اسی چیخ و پکار میں بارش تو تھم جاتی مگر پرنالے شور مچاتے رہتے۔

بچپن کی امیری نہ جانے کہاں کھو گئی دوست
جب بارش کے پانی میں میرے بھی جہاز چلا کرتے تھے

تو بابا آج نانی امی کا گُر آزمایا اور وہ کامیاب ثابت ہوا۔'' ابھی میں سانس لینے کو رکی ہی تھی کہ بابا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر برسات کی اصل بہار اور اس کے لوازمات کہاں ہیں، برسات تو اس کے بغیر ادھوری ہے۔'' پھر میری طرف شوخی سے دیکھا۔

''اوہ ہاں..... ٹھیک تو ہے بابا۔'' اور میں اندر سرپٹ بھاگی..... کہ امی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''ذرا دیکھ کے کیا بولائی، بولائی پھر رہی ہو۔'' اب جو سامنے نظر پڑی تو امی ٹرالی میں پکوڑے، سموسے، چٹنی سجائے (نازک سی ٹی کوزی سے ڈھکی کیتلی جو نفاست سے کشیدہ کاری سے آراستہ تھی) خراماں، خراماں چلی آرہی تھیں، دھانی چنری میں ان کا اترا اترا سا رنگ حسنِ سوگوار کا سماں پیش کر رہا تھا۔

''آپ بابا کے پاس بیٹھیں، میں ٹرالی لے کر آتی ہوں۔'' میں نے اپنے نمبر بڑھانے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی۔

''کوئی ضرورت نہیں اپنا حلیہ دیکھا ہے..... جا کے کپڑے بدلو، گیلے کپڑوں میں پھر رہی ہو، چھوئی موئی تو ہو۔ ابھی چھینکیں مار رہی ہوگی۔'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ اور پیشانی پر آئی گیلی لٹ کو جھٹکے سے پیچھے کیا۔ چند بوندیں اڑ کر میرے چہرے سے ٹکرائیں۔

''اونہہ جانے امی کیسے بابا کے دل کے بھید جان لیتی ہیں اور میرے بھی دل کا چور فوراً بھانپ لیا۔ اُف ایک تو یہ مائیں..... ابھی ہم سوچ رہے ہوتے ہیں اور وہ کر گزرتی ہیں۔'' اور میں اچھا کہتی ہوئی پلٹی..... اور وہ پتی ورتا اپنی بیماری کے باوجود مجازی خدا کی خدمت میں جا پہنچیں۔

مگر میں اپنا درد چھپا نہ پائی..... بال بناؤں کس کے لیے..... ایک شخص جو مجھے چھوڑ گیا۔

وہ مارچ کا ایک عام سا دن تھا، زرد پتوں کا ڈھیر آمدِ بہار کا پتا دے رہا تھا۔ ٹہنیوں پر نئے شگوفے سر نکالے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ ایسے میں کاظم کی میری زندگی میں انٹری ہوتی ہے۔ امی کی کوئی پرانی دوست کینیڈا سے آئیں تو ہمارے گھر کاظم (اپنے بیٹے) کے ہمراہ آئیں..... اور مجھے فتح کر گئیں۔ انہوں نے تو کمال یہ کیا اسی وقت پیار سے مجھے سمیٹ لیا۔

''ارے فصیحہ یہ تو آج سے میری بیٹی بن گئی۔'' میں نے سامنے بیٹھے ایک خوش شکل و خوش جمال نوجوان کو دیکھا سوبر نفیس اور نک سک سے سجا میرے دل کے آنگن میں سما گیا۔ جلد ہی مجھے کاظم کے نام سے

وابستہ کر دیا گیا۔ وہ ایم ایس کرنے امریکا جا رہا تھا اس لیے اصرار ہوا کہ جلد از جلد نکاح کے بندھن میں باندھ دیا جائے تاکہ کاظم دو سال میں پیپرز تیار کر کے ساتھ دلہن لے جائے۔ بڑوں کی رضامندی سے یہ فرض بھی ادا ہوا۔ اب ہمارا تعلق اسکائپ اور موبائل تک محدود ہو کر رہ گیا۔ دوریاں یوں قربتوں میں بدل گئی تھیں مگر آپ سوچ سکتے ہیں نکاح کے فوراً بعد سمجھنے اور سمجھانے کے دور سے دور ٹائم تو گزر جاتا کبھی وہ کہتا کہ "ایک سال دیکھو گزر گیا۔ دوسرا بھی گزر جائے گا اب تم کاؤنٹ ڈاؤن شروع کرو کیلینڈر پر نشان لگا کر مہم کا آغاز کرو۔" ہم کیسے کہتے کہ کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس طرح رو دھو کر ہم نے سال گزارہ بقول کسی کے رونا بھی ایک طرزِ گفتگو ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک آنسو ساری کہانی کہہ جاتا ہے۔ مگر کاظم سے ہم اٹھلا کر کہتے "ہم کیوں اپنا خوب صورت کیلینڈر برباد کریں" اور کن انکھیوں سے دیکھتے کہ جنوری گزرنے پر سرخ مارکر سے کراس کا نشان ہم لگا چکے تھے۔ "اچھا موبائل سے تصویر کھینچ کر کیلینڈر کی زیارت کراؤ....." اور ہم بے اختیار آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگے۔

کس مسافت کے بعد پہنچا
تیرے رخسار پر تیرا آنسو

کاظم نے ایک دن میری سوگوار آواز پر یہ شعر پڑھا تو بے اختیار میرا ہاتھ اپنے گالوں پر جا پہنچا۔

اب دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ دونوں گھرانے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ستمبر کا مہینہ بقول لوگوں کے ستمگر بن کر نازل ہوا۔ امی اور بابا باہر لان میں بیٹھے تھے گرمی شدید تھی پھر شاید گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو دونوں اندر آ گئے۔ جب ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں راہداری سے گزری تو بابا پریشانی کے عالم میں ایک ہاتھ سے گرتی ہوئی امی کو سنبھال رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ریسیور تھامے کسی سے سوال و جواب کر رہے تھے۔

"اوہ..... اچھا..... نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ..... اُف خدایا....." اور زور سے ریسیور کریڈل پر دے مارا۔ میں دوڑ کر قریب پہنچی دونوں کی حالت دیکھ کر میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جب ذرا بابا کے حواس بحال ہوئے تو وہ میری زندگی کا المناک لمحہ تھا۔ جب میرے گناہ گار کانوں نے سنا کہ کاظم اب ہم میں نہیں رہے..... پھر تو فون کالز موبائل میسج کا تانتا بندھ گیا۔ بعد کو یہ معلوم ہوا کہ واش روم میں سلپ ہو کر گرنے سے دماغ میں چوٹ آئی، بے ہوش ہو گئے فوری امداد نہ ملنے کی وجہ سے آکسیجن ختم ہو گئی۔ شام کو ساتھی نے دروازہ توڑا، پولیس آئی مگر میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ امی اس سانحے کے بعد دل کو روگ لگا بیٹھیں۔ میں نے یہ حالات دیکھ کر اپنے کو سنبھالا اور امی، بابا کی خاطر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ مگر لگتا تھا کہ ہم لوگ اندر سے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں..... امی اب ہارٹ اٹیک کے بعد بہت کمزور ہو گئی تھیں مگر بابا میری خاطر خود کو سنبھال رہے تھے۔ اور آج جب برسات میں مجھے یوں اجاڑ صورت دیکھا تو امی کہے بغیر نہیں رہ سکیں۔ اور میں تو امی کو بابا سے اتنا ٹوٹ کر پیار کرتے دیکھ کر اس سوچ میں تھی کہ ہم نے بھی تو ایسا ہی سوچا تھا کہ کاظم اور میں محبت کا تاج محل ایسے ہی تعمیر کریں گے۔ میرے والدین ایک مثالی جوڑا تھے خاندان، دوست احباب اور تمام جاننے والے حلقوں میں ان دونوں کو ہنسوں کے جوڑے کا خطاب ملا ہوا تھا۔

مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال
(ہم کس خیال میں ہیں اور آسمان کیا سوچ رہا ہے)

آج صبح سے دل کی دھڑکنوں پر کنٹرول نہیں، میں نے اور امی نے تو بابا کی خاطر دوبارہ خود کو مصروف کر لیا۔ کئی جگہ جاب کے لیے انٹرویو دے چکی ہوں۔

اس نے آوارہ مزاجی کو نیا موڑ دیا
پا بہ زنجیر کیا اور مجھے چھوڑ دیا
اس نے آنچل سے نکالی میری گم گشتہ بیاض
اور چپکے سے محبت کا ورق موڑ دیا

آفس جوائن کر کے ٹائم کافی پاس ہو جاتا۔ شام کو بابا اور امی کے پاس بیٹھ کر واپس اپنے کمرے میں جا گھستی۔ فرح میری سہیلی آج کل اپنے فائنل ایگزام میں مصروف ہے، اس کا میڈیکل کا آخری سال ہے تو اس کی شکل کو ترس گئی ہوں۔ اس کے بعد اس کی شادی ہے۔ جب بات کرو کہتی اب تم بھی اپنی زندگی کے بارے میں سوچو، تمہاری امی بہت فکر مند ہیں جب سے ان کے دل کا معاملہ ہوا ہے مجھ سے کہتی رہتی ہیں۔ منشی کو سمجھاؤ کسی کی یاد کے سہارے زندگی نہیں گزاری جا سکتی..... اور میں سوائے اس کو جھڑکنے کے کچھ نہیں کر سکتی..... میں تو ہجر کے الاؤ میں دہک کر انگارہ بن گئی ہوں۔ فرح تو اپنے ایک ہینڈسم کزن کا بہت پہلے بھی ذکر کرتی رہتی تھی اور اب کاظم کے بعد تو باقاعدہ مہم چلائی ہوئی ہے مگر میں مسلسل انکار کرتی آ رہی ہوں۔ ٹھیک ہے کہ کسی کے جانے سے زندگی نہیں بدلتی مگر یہ بھی غلط نہیں کہ جینے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ ابھی قدرت کو میرے کچھ امتحان اور درکار تھے امی جو سانس کی مریضہ تھیں اب دل کے دورے کے بعد بہت کمزور ہو گئی تھیں پھر کاظم کا یوں اچانک چلے جانا اس روز پھر انہیں سانس کا بہت زبردست اٹیک ہوا تھا۔ انہیلر بھی پوز کرا دیا مگر پھر بھی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر ان کا سر مانہ اونچا کیا۔ اُف چہرے کا رنگ نیلا پڑ رہا تھا۔ شاید آکسیجن کی ضرورت ہے بابا آج اپنے بزنس کے سلسلے میں بزی تھے۔ میں نے بابا کو موبائل پر کال کی بیل جاتی رہی اچانک دیکھا تو قریب تکیے کے پاس ان کا فون آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ اوہ مائی گاڈ..... فون کے پاس ایمرجنسی نمبر چیک کیے شکر ہے ایدھی ایمبولینس کا نمبر مل گیا۔

ڈاکٹر نے جب مایوسی سے گردن ہلائی تو میری جان ہی نکل گئی..... بقول ان کے اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ سلسلے توڑ گیا وہ بھی جاتے جاتے..... میری متاعِ عزیز، میری ماں میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

بابا تو امی کے بعد خشک خزاں رسیدہ پتے کی طرح بکھر گئے تھے۔ کبھی گھنٹوں گہری سوچ میں غرق رہتے..... کبھی امی کی وارڈ روب کھول کر کھڑے ہو جاتے۔ مجھے لگتا کہ اب ان کو خود سے باتیں کرنا شاید اچھا لگتا ہے۔ پہروں خود کلامی کرتے، دیواروں کو حسرت سے گھورا کرتے۔ راتوں کو اٹھ کر امی کو آوازیں دیتے "شبانہ..... شبانہ۔" پھر چیخ پڑتے میں دوڑ کر آتی، ان کو پانی پلاتی سکون آور دوا دیتی..... تو ذرا دیر کو سو جاتے۔ میں جو ستم بالائے ستم کے بعد زندگی کو گھسیٹ رہی تھی مجبور ہوئی کہ بابا کو سنبھالنا ہے ورنہ تو وہ غم سے حواس کھو بیٹھیں گے۔ میری مددگار فورس اب فرح ہی تھی اس سے اصرار کیا۔

"ابھی تمہارا ہاؤس جاب شروع نہیں ہوا تم کچھ دن میرے پاس آ جاؤ" میں نے آفس سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔" بابا کی حالت بہت خراب ہو گئی میرے ہینڈسم اور دلکش بابا کمزور اور لاغر ہوتے جا رہے تھے دو مہینے سے خوراک مختصر ہو کر برائے نام رہ گئی۔ وہ بیچاری دوڑی چلی آئی..... اب ہم دونوں نے محاذ سنبھال لیا۔ کبھی وہ بہانے، بہانے سے پھل کھلاتی اور ایک دن تو خوشۂ انگور کو ایسے کمال سے ایک، ایک دانہ گھما، گھما کر کھلایا، یہ دیکھیں انکل..... یہ دانا بہت میٹھا ہے۔ اور پھر دو تین دانے اٹھا کہ منہ میں ڈالتی کہ یہ اس سے بھی زیادہ رسیلا ہے۔ اسی طرح سے وہ روز کسی نہ کسی بہانے سے غذا کھلاتی رہی۔ پانچویں دن تک بابا بہت بہتری کی طرف آ گئے۔ فرح کی شوخی کیا بتاؤں کہ ایک پہاڑی دوشیزہ کی طرح معصوم اور الھڑ ہے بس صرف بغل میں ایک بکری کے بچے کی کسر باقی تھی۔ میڈیکل کالج میں سنا ہے کئی لڑکے مائل بہ کرم تھے..... مگر اظہارِ مدعا سے ڈرتے تھے..... یہ جب مزے، مزے لے کر ان ناکام عاشقوں کے قصے سناتی تو ہنستے، ہنستے بل پڑ جاتے۔ سنا ہے ایک عاشقِ نامراد پندرہ دن مسلسل صبح کالج جانے سے پہلے گیٹ پر ایک پھولوں کا گلدستہ رکھ جاتے تھے وہ تو خیر ہوتی فرح کی ہدایت پر گارڈ نے ایک دن مکمل مرمت کر دی جب جا کر سلسلہ